دیا ناتھ نے پھر پوچھا۔ یہ جگہ تو تیس روپے کی تھی۔ تمہیں بیس ہی کیوں ملے؟
رما ناتھ نے بات بنائی۔ نئے آدمی کو پوری تنخواہ کیسے دیتے۔ شاید سال چھ مہینے میں ترقی ہو جائے۔

رما نے دوسرے دن نیا سوٹ بنوایا۔ اور فیشن کی کتنی ہی چیزیں خریدیں۔ سسرال سے ملے ہوئے روپے کچھ بچ رہے تھے۔ کچھ دوستوں سے قرض لئے۔ وہ صاحبی ٹھاٹھ بنا کر سارے دفتر پر رعب جما دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اچھی آمدنی جبھی ہو سکتی ہے جب اچھا ٹھاٹھ ہو۔ سڑک کے چوکیدار کو یکے والے ایک پیسہ دے کر ٹال دیتے ہیں۔ اس کی جگہ سارجنٹ ہو تو کسی کی ہمت بھی نہ پڑے گی کہ اسے ایک پیسہ دکھائے۔ پھٹے حال بھکاری کے لئے ایک پٹکی کافی ہے۔ لیکن گیروے ریشم پہنے ہوئے باباجی کو شرماتے شرماتے بھی ایک روپیہ دینا ہی پڑتا ہے۔

تیسرے دن رما کوٹ پتلون پہن کر نکلا۔ تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔ چپڑاسیوں نے جھک جھک کر سلام کئے۔ رمیش بابو سے مل کر جب وہ اپنے کام کا چارج لینے آیا تو دیکھا۔ ایک برآمدے میں پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک میاں صاحب صندوق پر رجسٹر پھیلائے بیٹھے تھے اور بیوپاری لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔ سامنے ٹھیلے اور گاڑیوں کے بازار لگے ہوئے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے کام کی جلدی مچا رہے ہیں۔ سارا کام انتہا درجہ کی بے قاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا رما کو اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ سیدھا رمیش کے پاس جا کر بولا۔ کیا آپ مجھے بھی اس میلی دری پر بیٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک اچھی سی میز اور کئی کرسیاں بھجوائیے۔ رمیش بابو نے مسکرا کر میز اور کرسیاں بھجوا دیں۔ رما ناتھ شان سے کرسی پر بیٹھا۔ بوڑھے منشی جی اس کی رعونت پر دل میں ہنس رہے تھے۔ سمجھ گئے

ابھی نیا جوش ہے۔ نئی امنگ ہے۔ چارج دے دیا۔ چارج میں تھا ہی کیا۔ صرف ایک رجسٹر اور آج کی آمدنی کا حساب! محصول کے نرخ کا گوشوارہ موجود تھا۔ بوڑھے منشی جی نے اگر خود استعفےٰ دیا تھا۔ پر اس وقت یہاں سے جاتے ہوئے انہیں رنج ہو رہا تھا۔ اس جگہ وہ تیس سال سے برابر چلے آ رہے تھے۔ اسی جگہ کی بدولت انہوں نے بہت روپیہ کمایا۔ اسے چھوڑتے ہوئے کیوں نہ رنج ہوتا۔ چارج دے کر جب رخصت ہونے لگے تو رمانا تھا ان کے ساتھ زینہ تک نیچے گیا۔ خانصاحب اس کے اخلاق سے فروش ہو گئے اور بولے ہر ایک بلٹی پر ایک آنہ بندھا ہوا ہے۔ کھلا ہوا راز ہے۔ لوگ شوق سے دیتے ہیں آپ کو خدا نے توفیق دی ہے۔ مگر رسم نہ بگاڑیئے گا۔ ایک بار کوئی رسم ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس ایک آنے میں آدھا چپڑاسیوں کا حق ہے آدھا آپ کا۔ جو بڑے بابو پہلے تھے وہ پچیس روپے ماہوار لیتے تھے۔ مگر یہ تو بالکل بے لوث ہیں۔

رمانے بے دلی کے ساتھ کہا۔ مجھے تو یہ گندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں صفائی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھے میاں نے ہنس کر کہا۔ ابھی گندہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر اسی میں لطف آئے گا۔

خانصاحب کو رخصت کر کے رما اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اور ایک چپڑاسی سے بولا۔ ان لوگوں سے کہو کہ برآمدے کے نیچے چلے جائیں اور ایک ایک کر کے نمبروار آویں۔ ایک کاغذ پر سب کے نام نمبروار لکھ لیا کرو۔ جو پہلے آئے اس کا کام پہلے ہونا چاہیئے۔ مجھے یہ سیڑھیوں دھوں پسند نہیں کہ سب سے پیچھے والے شور مچا کر پہلے آ جائیں اور پہلے والے کھڑے منہ تکتے رہیں۔

کئی بیوپاریوں نے کہا۔ ہاں بابو جی یہ انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔

یہ حکم رما کا رعب جمانے کے لئے کافی تھا۔ روز گاڑیوں کے حلقے میں آج ہی اس باقاعدگی اور ضابطہ کی تعریف ہونے لگی ہے۔ کسی بڑے کالج کے پروفیسر کو اتنی شہرت عمر بھر میں نہ ملتی۔

دو چار دن کے تجربے سے رما کو سارے داؤ گھات معلوم ہو گئے۔ ایسی ایسی گھاتیں سوجھ گئیں جو خانصاحب کو خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں۔ مال کے وزن شمار اور تشخیص میں اتنی دھاندلی تھی جس کی کوئی حد نہیں۔ جب اس دھاندلی سے بیوپاریوں کو سینکڑوں کی بچت ہو جاتی ہے تو رما بلٹی پر ایک ایک آنہ لے کر کیوں قناعت کرے۔ ذرا سختی کا برتاؤ کر کے وہ دولت اور نیک نامی دونوں ہی حاصل کر سکتا ہے۔ پھر وہ اس سنہرے موقع کو کیوں چھوڑے۔

رما کی آمدنی تیزی سے بڑھنے لگی۔ آمدنی کے ساتھ وقار بھی بڑھا کہ سوکھی قلم گھسنے والے دفتر کے بابوؤں کو جب سگریٹ، پان، چائے یا چاٹ کی خواہش ہوتی تو رما کے پاس چلے آتے، یہی گنگا تھی جس میں سبھی ہاتھ دھو سکتے تھے۔ سارے دفتر میں رما کی تعریف ہونے لگی۔ پیسے کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ کیا دل ہے کہ واہ! اور جیسا دل ہے ویسی زبان بھی ہے، معلوم ہوتا ہے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی ہے۔ بابوؤں کا جب یہ حال تھا تو چپراسیوں اور چوکیداروں کا پوچھنا کیا؟ سب کے سب رما کے بن داموں غلام تھے۔ ان غریبوں کا وقار بھی بڑھا۔ جہاں گاڑیاں تک پھٹکار دیا کرتے تھے، وہاں اب اچھے اچھوں کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتے تھے۔ رما نا تھ کا سکہ بیٹھ گیا۔

مگر جالپا کی آرزوئیں ابھی ایک بھی پوری نہ ہوئیں۔ ناگ پنچمی کے دن محلے کی کئی لڑکیاں جالپا کے ساتھ کھیلنے آئیں۔ مگر جالپا اپنے کمرے کے باہر نہیں نکلی۔ بھادوں میں جنم اشٹمی کی تقریب آئی۔ پڑوس ہی میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کے

یہاں بڑے دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ وہاں سے ساس اور بہو کا بلاوا آیا، جاگیشر گئی۔ جالپا نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان تین مہینوں میں اس نے رما سے ایک بار بھی زیورو کا چرچا نہ کیا۔ اس گوشہ تنہائی میں وہ اس فہرست کو دیکھا کرتی، جو رما ایک دن کہیں سے اُٹھا لایا تھا، اس میں طرح طرح کے نفیس زیوروں کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ رما کو دیکھتے ہی وہ فہرست چھپا لیتی تھی۔ اپنی گرویدگی کا پردہ ڈھکا رکھنا چاہتی تھی۔

رما آدھی رات کے بعد لوٹا تو دیکھا جالپا کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے — ہمدردانہ انداز سے بولا۔ تم گئی کیوں نہیں۔ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ بڑا اچھا گانا ہو رہا تھا۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا "تم تو سُن آئے۔ میں نہ گئی تو کیا ہوا۔ وہاں جاتی تو کس کے منہ میں کالک لگتی"

رما شرمندہ ہو کر بولا۔ کالک لگنے کی کوئی بات نہ تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ چوری ہو گئی ہے اور اس زمانے میں دو چار ہزار روپیہ کی چیزیں بنوا لینا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔

چوری کا لفظ زبان پر لاتے ہی رما کا کلیجہ دھڑک اُٹھا۔ جالپا شوہر کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن رما کو اس کی نگاہ سے ایسا مترشح ہوا۔ گویا اسے چوری کا راز معلوم ہے اور محض حجاب کے باعث اسے زبان پر نہیں لاتی۔ انہیں اس خواب کی بھی یاد آئی جو جالپا نے اس رات کو دیکھا تھا۔ وہ نگاہ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اُسے پھر خیال آیا شاید مجھے دھوکا ہوا۔ اس کی نگاہ میں غصہ کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ مگر یہ چپ کیوں۔ کچھ بولتی کیوں نہیں۔ اس کی خاموشی غضب تھی۔ اپنا شبہ رفع کرنے اور جالپا کے دل کی تھاہ لینے کے لئے گویا اس نے ڈبکی لی۔ یہ کون جانتا تھا کہ اس کے گھر میں

رکھتے ہی یہ مصیبت تمہاری پیشوائی کرے گی۔

جالپا آنکھوں میں آنسوں بھر کر بولی۔ تو میں تم سے زیوروں کا تقاضا تو نہیں کرتی تقدیر کے نوشتہ کو انسان ٹال سکتا تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ جن عورتوں کو زیور میسر نہیں ہوتے کیا ان کے دن نہیں کٹتے۔

اس جواب نے رما کا شبہ تو رفع کر دیا تھا۔ مگر اس میں جو نالۂ درد چھپا ہوا تھا اس سے چھپا نہ رہا۔ ان تین مہینوں میں بہت احتیاط کرنے پر بھی وہ سو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکا تھا۔ بابوؤں کی خاطر اور تواضع میں اسے بہت پل کھانا پڑتا تھا۔ مگر بغیر کھلائے پلائے کام بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ سبھی اس کے دشمن ہو جاتے اور اسے اکھاڑنے کی گھاتیں سوچنے لگتے۔ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ہاں وہ خود ایک پیسہ بھی فضول نہ خرچ کرتا۔ ہشیار بیوپاری کی طرح وہ جو کچھ خرچ کرتا تھا وہ صرف کمانے کے لئے۔ اسے تسلی دے کر بولا۔ ایشور نے چاہا ایک آدھ چیز بن ہی جائے گی۔

جالپا نے صابرانہ انداز میں کہا۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو زیوروں پر جان دیتی ہیں۔ اسی طرح کسی کے گھر آتے جاتے شرم آتی ہے۔

جالپا کے ایک ایک لفظ سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی روحانی خلش کا باعث کون تھا۔ جالپا نے اگر لحاظ کے مارے زیوروں کا ذکر نہ کیا تو رما اس کے آنسو پونچھنے کے اس کی دلجوئی کرنے کے لئے کیا خاموشی کے بجائے کوئی تدبیر نہ تھی۔ محلے میں روز ہی ایک نہ ایک تقریب آتی رہتی ہے۔ روز ہی پاس پڑوس کی عورتیں ملنے آتی ہیں۔ بیچاری جالپا کب تک اس طرح اپنے دل پر جبر کرتی رہے گی۔ ہنسنے بولنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کون قیدیوں کی طرح اکیلے پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔

اس نے سوچا کیا کسی تدبیر سے زیور ادھار نہیں لئے جا سکتے۔ کئی بڑے بڑے صرافوں سے اس کا دوستانہ ہو گیا تھا۔ لیکن مشکل یہی تھی کہ ان سے کہے کون۔ ممکن ہے کہ وہ انکار ہی کر دیں یا کوئی بہانہ کر کے ٹال دیں۔ تو مفت کی خفت ہو۔ اس نے طے کیا کہ ابھی ادھار لینا مناسب نہ ہوگا۔ کہیں وعدے پر روپے نہ ادا ہوئے تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ابھی کچھ دن اور صبر کرنا چاہیئے۔

دفعتاً اسے خیال آیا۔ دیکھوں جالپا کی اس معاملے میں کیا رائے ہے۔ اگر جالپا کو خواہش ہو تو وہ کسی صراف سے سلسلہ جنبانی کرے گا اور ذلت اور شرمندگی کو خوشی سے برداشت کرے گا۔ بولا۔ تم سے ایک صلاح کرنا چاہتا ہوں۔

جالپا کو نیند آ رہی تھی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے بولی۔ اب سونے دو۔ بھائی! سویرے اُٹھنا ہے۔

رما نے پوچھا۔ اگر تمہاری رائے ہو تو کسی صراف سے وعدے پر چیزیں بنوا لاؤں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا بے رحمانہ سوال تھا۔ کسی مہمان سے پوچھنا کہ کہئے تو آپ کے لئے کھانا لاؤں۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ ہم مہمان کو کھانا کھلانا نہیں چاہتے۔ رما کو لازم تھا کہ چیزیں لا کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی اسے یہی کہنا چاہیئے تھا کہ نقد لایا ہوں۔ تب وہ البتہ خوش ہوتی۔ اس معاملے میں اس کی صلاح لینا اس کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ جالپا نے رما کی طرف نامہربان نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو زیوروں کے لئے اتنی بے قرار نہیں ہوں۔

رما نے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ آخر اس میں کیا حرج ہے کہ کسی صراف سے سودا کر لیا جائے۔ روپے رفتہ رفتہ چکا دیئے جائیں گے۔

جالپا نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ نہیں میرے لئے قرض لینے کی ضرورت

نہیں۔ میں بیوا نہیں ہوں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا راستہ لوں۔ مجھے تمہارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر مجھے ساری عمر زیوروں کے بغیر رہنا پڑے۔ تو بھی میں قرض لینے کو نہ کہوں گی۔ عورتوں کو گہنوں کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔ گھر کے آدمیوں کو مصیبت میں ڈال کر زیور پہننے والیاں دوسری ہونگی۔ لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا۔ جگہ بڑی آمدنی کی ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بچت نہیں دکھائی دیتی۔

رما نے صفائی دی۔ بچت تو ضرور ہوتی۔ اور اچھی ہوتی۔ لیکن جب اہلکاروں کے مارے بچنے بھی پائے۔ سب کے سب شیطان کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔

تو ابھی کونسی جلدی ہے۔ بنتے رہیں گے آہستہ آہستہ!

خیر تمہاری صلاح ہے تو ابھی خاموش رہتا ہوں۔ میں سب سے پہلے کنگن بنواؤں گا۔

تمہارے پاس ابھی اتنے روپے کہاں ہوں گے؟

اس کی فکر میں کرونگا۔ تمہیں کیسا کنگن پسند ہے۔

جالپا اپنے مصنوعی استغنا کو نہ نبھا سکی۔ الماری میں سے زیوروں کی فہرست نکال کر رما کو دکھانے لگی۔ اس وقت وہ اتنی سرگرم تھی۔ گویا سونا آکر رکھا ہوا ہے سنار بیٹھا ہوا ہے صرف وضع کا پسند کرنا باقی ہے۔ اس نے فہرست کے دو ڈیزائن پسند کئے اور دونوں نہایت خوشنما۔ مگر رما ان کی قیمت دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ ایک ایک ہزار کا تھا۔ دوسرا آٹھ سو کا۔

رما نے ٹال کر کہا۔ ایسی چیزیں تو یہاں بن بھی نہ سکیں۔ مگر کل میں ذرا صرافے کی سیر کرونگا۔

جالپا نے فہرست کو بند کر کے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ تمہارے پاس نہ جانے کبھی روپے ہوں گے یا نہیں۔ اونہہ! نہیں گے۔ نہیں کون کوئی گہنے کے بغیر مرا جاتا ہے۔

رما کو آج اس ادھیڑ بن میں بڑی دیر میں نیند آئی۔ یہ جڑاؤ کنگن اس گوری گوری کلائیوں پر کتنے بھلے معلوم ہونگے۔ یہ دل آویز خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب اُسے نیند آگئی۔

(۱۲)

دوسرے دن سویرے ہی رما نے رمیش بابو کے گھر کا راستہ لیا۔ ان کے یہاں جنم اشٹمی کی جھانکی ہوتی تھی۔ انہیں خود تو اس سے کوئی شوق نہ تھا، مگر ان کی بیوی یہ جشن منا تھیں۔ اس کی یادگار میں وہ اب تک رسم ادا کرتے جاتے تھے۔ رما کو دیکھ کر بولے، آؤ جی رات کیوں نہیں آئے۔ مگر یہاں غریبوں کے گھر کیوں نہیں آتے۔ سیٹھ جی کے یہاں تو خوب بہار ہوگی۔

رما۔ ایسی سجاوٹ تو نہ تھی، ہاں کھانے کا اچھا انتظام تھا۔ کئی کتھک اور کئی طوائفیں بھی تھیں۔

رمیش۔ سیٹھ جی نے تو وعدہ کیا تھا کہ طوائفیں نہ آنے پائیں گی۔ مگر اس کی پروا نہ کی۔ ایک تو طوائفوں کا ناچ یوں ہی برا۔ اس پر ٹھاکر دوارے میں۔ نہ جانے ان گدھوں کو کب عقل آئے گی۔

رما۔ طوائفیں نہ ہوں تو جھانکی کو دیکھنے جائے ہی کون۔ سبھی تو آپ کی طرح رسا نہیں ہیں۔

رمیش۔ خیر! فرصت ہو تو آؤ۔ ایک آدھ بازی ہو جائے۔

رما۔ اور آیا کس لئے ہوں۔ مگر آج آپ کو میرے ساتھ صرافے تک چلنا پڑے گا۔

رمیش۔ چلنے کو چلا چلوں گا۔ مگر اس معاملے میں میں بالکل کورا ہوں، نہ کو

چیز بنوائی نہ خریدی۔ تمہیں کچھ لینا ہے؟

رما۔ لینا دینا کیا ہے۔ ذرا بھاؤ تاؤ دیکھنا ہے؟

رمیش۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں پھٹکار پڑی ہے۔

رما۔ وہ تو زیوروں کا نام تک نہیں لیتی۔ لیکن اپنا فرض تو کچھ ہے؟

رمیش۔ شاید کچھ روپے جمع کر لئے۔

رما۔ روپے کس کے پاس ہیں، وعدے پر لونگا۔

رمیش۔ بھائی اس خبط میں نہ پڑو۔ جب تک روپے ہاتھ میں نہ ہوں بازار کی طرف جاؤ ہی مت۔ زیوروں سے تو بڈھے نئی بیبیوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں۔ جوانوں کے لئے بہت سے لٹکے ہیں۔

رما۔ میں دو تین مہینے میں سب روپے ادا کر دونگا۔ اگر اس کا یقین نہ ہوتا تو میں ذکر ہی نہ کرتا۔

رمیش۔ تو دو تین مہینے اور کیوں صبر نہیں کر جاتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری آمدنی اچھی ہے۔ لیکن آئندہ کے بھروسے پر اور جو کام چاہے کرو۔ قرض کبھی مت لو۔ زیوروں کا قرض اس غریب ملک میں نہ جانے کیسے پھیل گیا۔ جنہیں روٹیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں، وہ بھی زیوروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ ہر سال اربوں روپے سونا چاندی خرید میں صرف ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک میں زیوروں کا اتنا رواج نہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت تجارت میں صرف ہوتی ہے جس سے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں دولت آرائش میں خرچ ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ جس ملک میں جتنی ہی زیادہ جہالت پیدا ہوتی ہے اتنا ہی زیوروں کا رواج ہوتا ہے۔ یہاں تو خیر ناک کان چھدا کر ہی رہ جاتے ہیں، مگر بعض ایسے ملک بھی ہیں جہاں ہونٹ چھدوائے جاتے ہیں۔ اور اس میں زیور پہنتے ہیں۔

رما۔ وہ کونسا ملک ہے۔

رمیش۔ اس وقت تو ٹھیک یاد نہیں آتا۔ شاید افریقہ ہو۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے ملک والوں کے لئے ناک کان کا چھیدنا کم کچھ تعجب کی بات نہ ہوگی۔ برا مرض ہے! وہ دولت جو کھانے پینے میں صرف ہونی چاہیئے۔ بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر زیوروں کی نذر کردی جاتی ہے۔ بچوں کو دودھ نہ ملے نہ سہی۔ نتھنی کی بو تک ان کی ناک میں نہ پہنچے نہ سہی۔ میووں اور پھلوں کے درشن انہیں نہ ہوں، کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر بیوی گہنے ضرور پہنے گی۔ اور میاں گہنے ضرور بنوائیں گے۔

رما۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ ایسا کوئی بھی ملک نہیں۔ جہاں عورتیں زیور نہ پہنتی ہوں۔

رمیش بابو اس بحث میں شطرنج بھول گئے۔ چھٹی کا دن تھا ہی۔ دو چار ملنے والے اور آگئے۔ رما پنکھے سے کھسک آیا۔ اس بحث میں ایک بات ایسی تھی جو اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب وہ قرض گہنے نہ لے گا۔ صرافے تک گیا ضرور۔ مگر کسی دوکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ گھر پہنچا۔ تو نو بج گئے تھے۔ دیا ناتھ نے اس کو دیکھا تو پوچھا۔ آج تم سویرے سویرے کہاں چلے گئے تھے۔

رما۔ ذرا بڑے بابو سے ملنے گیا تھا۔

دیا ناتھ۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے کتب خانے کیوں نہیں چلے جایا کرتے ہو۔ تمہارے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ امتحان نہ سہی۔ اپنی لیاقت تو بڑھا سکتے ہو۔ ایک سیدھا خط لکھنا پڑ جاتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ اصلی تعلیم مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع

باتیں سنی ہیں جن سے مجھے رنج ہوا۔ اور تمہیں میں سمجھا رہا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں حرام ایک کوڑی بھی آئے۔

رما نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ آپ سے کس نے یہ بات کہی۔ میں اس کی موچھیں اکھاڑ لونگا۔

دیا ناتھ۔ کسی نے بھی کہی ہو۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں۔ لیکن بات سچ ہے یا جھوٹ۔ میں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔

" بالکل جھوٹ۔"

" بالکل جھوٹ۔"

" جی ہاں بالکل جھوٹ۔"

" تم دستوری نہیں لیتے۔"

" دستوری رشوت نہیں ہے۔ سبھی لیتے ہیں اور علانیہ لیتے ہیں۔ لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ میں کسی سے مانگنے نہیں جاتا۔"

" سبھی علانیہ لیتے ہیں اور بغیر مانگے دیتے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ رشوت اچھی چیز ہے۔"

" دستوری بند کر دینا میرے قابو کی بات نہیں۔ میں خود نہ لوں۔ مگر چپڑاسی اور محرر کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آٹھ آٹھ نو نو روپیہ پانے والے نوکر اگر نہ لیں تو ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔"

دیا ناتھ۔ میں نے تمہیں سمجھا دیا۔ ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

یہ کہتے ہوئے دیا ناتھ دفتر چلے گئے۔ رما کے جی میں آیا صاف کہہ دے۔ آپ نے بے لوث بن کر زندگی میں کیا کر لیا۔ کہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیشہ پیسے پیسے کو محتاج رہے ہیں۔ لڑکوں کو پڑھا تک نہیں سکے۔ یہ دیانتداری اس وقت اچھی معلوم ہوتی جب کہ نیت بھی صاف رہتی۔ اور زندگی بھی آرام سے گزرتی۔

رما گھر میں گیا تو ماں نے پوچھا۔ تمہارے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے تھے؟

رما۔ مجھے تعلیم دے رہے تھے کہ دستوری مت لیا کرو۔

جاگیشری۔ تم نے کہا نہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری کی تو کون سے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ساری زندگی پیٹ پالتے رہے۔

رما۔ کہنا تو چاہتا تھا مگر چڑھ جاتے۔ آپ کو لینے کا شعور تو ہے نہیں جب دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلتی تو بھگت بن گئے۔ بیوپاریوں سے روپے نکالنے کے لئے عقل چاہیئے جہاں کسی نے بھگت پن کی لی اور میں سمجھ گیا کہ بدھو ہے لینے کی تمیز نہیں۔ کیا کرے بیچارہ کسی طرح آنسو تو پونچھتے۔

جاگیشری۔ بس بس یہی بات ہے بیٹا جسے لینا آئے گا وہ ضرور دے گا۔ انہیں تو بس گھر میں قانون بگھارنا آتا ہے۔

رما دفتر جاتے وقت، اوپر کپڑے پہننے گیا۔ تو جالپا نے اسے تین لفافے ڈاک میں چھوڑنے کے لئے دیئے۔ اس وقت اس نے تینوں لفافے جیب میں ڈال لیئے۔ لیکن راستے میں انہیں کھول کر چٹھیاں پڑھنے لگا۔ خط کیا تھے؟ مصیبت اور درد کی داستان تھی جو اس نے اپنی سہیلیوں کو سنائی تھی۔

رما نے تینوں چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ڈاک خانہ سامنے سے گذر گیا۔ پر اس نے انہیں چھوڑا نہیں۔ جالپا ابھی تک یہی سمجھتی ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اگر اپنا بس ہوتا تو اسی وقت زیوروں کے ٹوکرے بھر بھر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ یا اسے کسی بڑے صراف کی دکان پر لے جا کر کہتا۔ لہتیں جو جو چیزیں لینی ہوں لے لو۔ رما کو آج اس درد کا صحیح اندازہ ہوا جو جالپا کے دل کو بے چین کر رہا تھا ایسی حالت میں رما کو وعدے پر زیور لانے میں تامل کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔

دفتر پہنچا تو برآمدے میں مال تولا جا رہا تھا۔ میز پر روپے پیسے رکھے جا رہے

تھے اور رما فکر میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ کس سے صلاح لے۔ اسے آج اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ اس نے شادی ہی کیوں کی۔

جب وہ گھر کی حالت سے واقف تھا تو اس نے شادی سے انکار کیوں نہ کر دیا۔ آج اس کا جی مطلق کام میں نہ لگا۔ معین وقت سے پہلے اٹھ کر گھر چلا گیا۔

جالپا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ میری چٹھیاں چھوڑ تو نہیں دیں؟

رما نے بہانہ کیا۔ مطلق یاد نہ آئی۔ جیب میں پڑی رہ گئیں۔

جالپا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ لاؤ مجھے دیدو۔ اب نہ بھیجوں گی۔

رما۔ کیوں کل بھیجدوں گا۔

جالپا۔ نہیں اب مجھے بھیجنا ہی نہیں ہے۔ میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئی تھی جو نازیبا تھیں اگر تم نے خط چھوڑ دیئے ہوتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا۔ میں نے ان میں تمہاری شکایت کی تھی۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

رما۔ شوہر بدنیت ہے دغا باز ہے۔ حیلہ ساز ہے۔ اس کی اگر تم نے شکایت کی تو کیا بُرا کیا؟

جالپا نے گھبرا کر پوچھا۔ تم نے خط پڑھ لئے تھے کیا؟ تب تو تم مجھ سے بہت ناراض ہو گئے۔

رقت سے جالپا کی آواز رک گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آنچل پر گرنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس نے دل کو سنبھال کر کہا۔ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔ جو سزا چاہے دو۔ پر ہم سے ناراض مت ہو۔ ایشور جانتے ہیں تمہارے جانے کے بعد مجھے کتنا افسوس ہوا۔ میری قلم سے نہ جانے کیسے وہ باتیں نکل گئیں۔

جالپا جانتی تھی کہ رما ناتھ کو زیوروں کی فکر مجھ سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہے۔ لیکن ہمدردوں سے اپنی داستان غم کہتے وقت ہم اکثر مبالغہ کر جایا کرتے ہیں۔ جو باتیں پردے کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر کر دینے سے قربت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ ہے۔

رما جالپا کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ ناخوش ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ امید کی تاخیر ہی مایوسی ہے۔ کیا میں اتنا نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کر دیا ہوتا تو اب تک میں نے کسی نہ کسی طرح دو ایک چیزیں بنوا دی ہوتیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے تم سے صلاح لی۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ رہا کہ ایسی حالتوں میں آدمی خواہش رہنے پر بھی نہیں نہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اب میں وہ غلطی نہ کروں گا۔

جالپا نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ تو کیا قرض لاؤ گے؟

رما۔ کیا حرج ہے؟ جب سود نہیں دینا ہے تو جیسے نقد ویسے ادھار۔ قرض سے دنیا کا کام چلتا ہے۔ کون قرض نہیں لیتا۔ یوں روپے ملتے بھی ہیں۔ تو الٹے تللے خرچ ہو جاتے ہیں۔ قرض سر پہ سوار ہو گا تو اس کی فکر ہاتھ کو روکے رہے گی۔

جالپا۔ میں تمہیں فکر میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اب میں بھول کر بھی زیوروں کا نام نہ لوں گی۔

رما۔ نام تو تم نے کبھی نہیں لیا۔ لیکن تمہارے نام نہ لینے سے میرا فرض تو پورا نہیں ہو جاتا۔ تم قرض سے ناحق ڈرتی ہو۔ روپے جمع ہو جانے کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا تو شاید کبھی بھی جمع نہ ہوں گے۔

جالپا۔ مگر پہلے کوئی چھوٹی سی چیز لانا۔

رما۔ ہاں ہاں۔ ایسا تو کرونگا ہی۔

رما بازار چلا تو خوب اندھیرا ہو چلا تھا۔ دن رہتے جاتا تو یہ خوف تھا کہ اس پر دوستوں کی نگاہ پڑ جاتی۔ منشی دینا ناتھ ہی دیکھ لیتے۔ وہ اس معاملے کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

(۱۳)

صرافے میں گنگو کی دکان مشہور تھی۔ گنگو تھا تو برہمن مگر تھا پکا بنیا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا تقدس گاہکوں میں یقین پیدا کرتا تھا۔ دوسری دکانوں پر لوگوں کو ٹھگے جانے کا خوف ہوتا تھا۔ اس دوکان پر دغا بازی کا اندیشہ نہ تھا۔ گنگو نے رما کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ آئیے بابو صاحب اوپر آئیے۔ منیم جی آپ کے واسطے پان منگواؤ کیا حکم ہے بابو جی؟ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ غریبوں پر کبھی کبھی کرم کیا کیجئے۔

گفتگو کے اخلاق نے رما کی ہمت کھول دی۔ اگر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا تو شاید رما کبھی دوکان پر جا ہی نہ سکتا۔ دوکان پر جا کر بولا۔ یہاں ہم جیسے مزدوروں کا کہاں گذر ہے۔ مہاراج! گرہ میں کچھ ہو تو؟

گنگو نے ان کے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی منگوائی اور بولا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں بابو صاحب آپ کی دکان ہے۔ جو چیز چاہیئے لے جائیے۔ دام آگے پیچھے ملتے رہیں گے۔ ہم لوگ آدمی کو پہچانتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دکھاؤں کوئی جڑاؤ چیز؟ کوئی کنگن۔ کوئی ہار۔ ابھی حال ہی میں دلی سے مال آیا ہے۔

"کوئی ہلکے داموں کا ہار دکھائیے؟"

"یہی کوئی سات آٹھ سو کا۔"

"اجی نہیں کوئی چار سو تک حد ہے۔"

گنگو نے زیوروں کا صندوقچہ منگا کر کہا۔ میں آپ کو دونوں دکھائے دیتا ہوں۔ جو پسند آئے رکھ لیجئے گا۔ ہمارے یہاں کسی طرح کا دگل پھیل نہیں ہے بابو صاحب۔

اس کی آپ ذرا بھی فکر مت کریں۔ پانچ برس کا لڑکا ہو یا سو برس کا بوڑھا سب کے ساتھ ایک بات رکھتے ہیں۔ مالک کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔

گنگو نے ہار نکال نکال کر دکھانے شروع کئے۔ رما کی آنکھیں کھل گئیں طبیعت لوٹ پوٹ ہو گئی۔ کیا صفائی تھی۔ رنگینیوں کی خوبصورت سجاوٹ۔ کتنی آب و تاب آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ رما نے سوچ رکھا تھا سو روپیہ سے زیادہ اُدھار نہ رکھونگا۔ لیکن چار سو والا ہار آنکھوں میں کچھ نہ جچتا تھا اور جیب میں تھے کل تین سو روپے سوچا یہ ہارے گیا اور جالپا نے پسند نہ کیا تو فائدہ ہی کیا۔ ایسی چیز لے جانی چاہیئے کہ وہ دیکھتے ہی پھڑک اٹھے۔ یہ جڑاؤ ہار اس کی گردن میں کتنا خوشنما معلوم ہوگا۔ وہ ہار ایک ہزار مرصع آنکھوں سے گویا رما کے دل کو کھینچنے لگا۔ وہ ایک سکوت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کہیں گنگو نے تین سو روپے اُدھار ماننے سے انکار کر دیا تو اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گنگو بشرے سے اس کے دل کی بات تاڑ کر بولا۔

آپا کے لائق تو بابو جی یہی چیز ہے۔ اندھیرے گھر میں رکھ دیجئے تو اُجالا ہو جائے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ پسند تو مجھے بھی یہی ہے۔ لیکن میرے پاس کل تین سو روپے ہیں، یہ سمجھ لیجئے۔

گنگو نے خلوص کے ساتھ کہا۔ بابو صاحب روپیہ کا ذکر ہی نہ کیجئے۔ حکم ہو تو دس ہزار کا مال ساتھ بھیجدوں۔ مرضی ہو تو ایک آدھ چیز اور دکھاؤں۔ ایک شیشی پھول بن کر آیا ہے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو جائے گا اور دام بھی کچھ ایسا بھاری نہیں ہے۔ آپ کو ایک ڈھائی سو میں مل جائے گا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ مہراج بہت باتیں بنا کر الٹے چھرے سے نہ مونڈ لیجیے گا۔ اس معاملے میں میں بالکل اناڑی ہوں۔

گنگو۔ ایسا نہ کہو بابوجی! آپ چیز لے جائیے بازار میں دکھا لیجئے۔ اگر کوئی یہ چیز ڈھائی سو سے کوڑی کم میں دے تو میں مفت دے دونگا۔

شیش پھول آیا۔ سچ مچ گلاب کا پھول تھا۔ جس پہ ہیرے کی کنیاں اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رما کی ٹکٹکی بندھ گئی۔

گنگو۔ ڈھائی سو تو کاریگر کی صفائی کا انعام ہے بابوجی یہ وہ چیز ہے؟

رما۔ ہاں ہے تو بہت خوبصورت! مگر ایسا نہ ہو کل ہی دام کا تقاضہ کرنے لگو۔ میں خود ہی جہاں تک ہو سکے گا جلد دے دونگا۔

گنگو نے دونوں چیزیں دو خوبصورت مخملی کیس میں رکھ کر رما کو دے دیں۔ رما کی مسرت کا اس وقت اندازہ نہ تھا۔ مگر یہ خاص مسرت نہ تھی۔ اس میں ایک اندیشہ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ اس بچے کی خوشی نہ تھی جس نے ماں سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو۔ بلکہ اس بچے کی خوشی تھی جس نے پیسے چرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں لیکن دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔ ساڑھے پانچ سو روپیہ ادا کرنے کی تو اسے زیادہ فکر نہ تھی اگر زمانہ موافق ہو تو چھ مہینے میں بیباق کر سکتا ہے۔ خوف یہی تھا کہ بابوجی سنیں گے تو ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا جالپا کو ان زیوروں سے آراستہ دیکھنے کا اشتیاق اس خوف پر غالب آتا جاتا تھا۔ گھر پہونچنے کی عجلت میں اس نے سڑک چھوڑ دی اور ایک گلی میں گھس گیا۔ گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل تو اسی وقت آ گئے تھے جب وہ گھر سے چلا تھا۔ وہ گلی میں گھسا ہی تھا کہ پانی کی بوندیں چھروں کی طرح اوپر پڑیں۔ جب تک چھتری کھولے وہ لت پت ہو چکا تھا۔ اسے دہشت ہوئی اس اندھیرے

میں کوئی آکر دونوں چیزیں نہ چھین لے۔ اندھیری گلیوں میں خون تک ہو جاتے ہیں چھپانے لگا اس طرف سے ناحق آیا۔ دو چار منٹ دیر ہی میں پہنچتا تو ایسی کونسی آفت آجاتی۔ بارے کسی طرح گلی کا خاتمہ ہوا اور سڑک ملی۔ لالٹین نظر آئی۔ روشنی کتنی اعتقاد انگیز چیز ہے اس کا آج اسے عملی تجربہ ہوا۔

وہ گھر پہنچا تو دیا ناتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی آنکھ بچا کر وہ اندر جانا چاہتا تھا کہ انہوں نے ٹوکا۔ اس وقت کہاں گئے تھے۔

رما نے انہیں کچھ جواب نہ دیا۔ کہیں وہ اخبار سنانے لگیں تو گھنٹوں کی خبریں لیں۔ سیدھا اندر جا پہونچا۔ جالپا دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی فوراً اس کے ہاتھ سے چھتری لے لی۔ اور بولی۔ تم تو بالکل بھیگ گئے کہیں ٹھہر نہ گئے۔

رما۔ پانی کا کیا ٹھکانہ رات بھر برستا رہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اوپر چلا گیا۔ اس نے سمجھا تھا جالپا بھی پیچھے پیچھے آتی ہوگی۔ پر وہ نیچے بیٹھی اپنے دیوروں سے باتیں کر رہی تھی۔ گویا اُسے زیوروں کی یاد ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ بالکل بھول گئی ہے کہ رما صرافے سے آیا ہے۔

رما نے کپڑے بدلے اور دل میں جھنجلاتا ہوا نیچے آیا۔ اسی وقت دیا ناتھ کھانا کھانے آگئے۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جالپا نے ضبط تو کیا پر اس اضطراب کی حالت میں آج اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو رما چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مذاق کر کے بولا۔ آج تو صرافے کا جانا بیکار ہو گیا۔ ہار کہیں تیار ہی نہ تھا بنانے کو کہہ آیا ہوں۔

جالپا کا اشتیاق سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی بنتے بنتے پانچ چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔

رما۔ نہیں جی بہت جلد بنا دے گا قسم کھا رہا ہوں۔

جالپا۔ اونہہ۔ جب چاہے دے۔

جالپا منہ پھیر کر لیٹنے جا رہی تھی کہ رما نے زور سے قہقہہ مارا۔ جالپا چونک پڑی سمجھ گئی۔ رما نے شرارت کی تھی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ تم بھی بڑے نٹ کھٹ ہو۔ کیا لائے؟

رما۔ کیا چکھ دیا۔

جالپا۔ یہ تو مردوں کی عادت ہی ہے۔ تم نے نئی بات کیا کی؟

جالپا دونوں زیوروں کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں سی اُٹھنے لگیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی کہ رما اُسے اوچھی نہ سمجھنے لگے مگر ایک ایک عضو کھلا جاتا تھا۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے رخسار اور کھلے ہونٹ انشائے راز کئے دیتے تھے۔ اس نے ہار گلے میں پہنا۔ شیش پھول سجایا اور خوشی سے متوالی ہو کر۔ تمہیں دعا دیتی ہوں۔ ایشور تمہاری ساری آرزوئیں پوری کرے۔

آج جالپا کی وہ تمنا پوری ہوئی۔ جو بچپن ہی سے اس کے تخیل کا ایک زرین خواب اس کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آج اس کی وہ سادھ پوری ہوئی۔ اگر ماں کی بیاں ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ ہار اسے دکھاتی اور کہتی۔ تمہارا ہار تمہیں مبارک ہو۔

رما پر گھڑوں نشہ چڑھا تھا۔ آج اسے پہلی بار زندگی کا مزا حاصل ہوا۔

جالپا نے پوچھا جا کر اماں کو دکھا آؤں۔

رما نے جوالکسار دکھا کر کہا۔ اماں کو کیا دکھانے جاؤ گی۔ ایسی کون سی بڑی چیزیں ہیں۔

جالپا۔ اب تم سے سال بھر تک اور کسی چیز کے لئے نہ کہوں گی۔ یہ روپے ادا کر دوں گی میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گا۔

رما نے پُرطمع دراندازسے کہا۔ روپوں کی کیا فکر؟ ہیں ہی کتنے؟

جالپا۔ [illegible] دیکھ [illegible] کتنے ہیں۔

رما۔ مگر یہ کہنا ادھار لائے ہیں۔

جالپا اس طرح دوڑی ہوئی نیچے گئی گویا اُسے وہاں کوئی خزانہ مل جائے گا۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ رما خوشی کی نیند سو رہا تھا۔ جالپا نے چھت پر آکر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ کاتک کی چاندنی جس میں نغمے کا سکون ہے اور شعر کی روحانیت! اس نے کمرے میں آکر اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے وہ کانچ کا چندن ہار نکالا جسے پہن کر وہ ایک دن پھولی نہ سمائی تھی مگر اب اس نئے ہار کے سامنے اس کی چمک اس طرح ماند پڑ گئی تھی۔ جیسے اس شفاف چاندنی کے سامنے تاروں کی روشنی۔ اس نے اس نقلی ہار کو توڑ ڈالا اور اس کے دانوں کو نیچے گلی میں پھینک دیا۔ اسی طرح جیسے پوجا ختم ہونے کے بعد کوئی بھگت مٹی کی مورتوں کو پانی میں فنا کر دیتا ہے۔

(۱۴)

اس دن سے جالپا کی زندگی میں ایک نیا پہلو رونما ہوا۔ رما نہانے جاتا تو اسے اپنی دھوتی چُنی ہوئی ملتی۔ طاق پر تیل اور صابون بھی رکھا ہوا پاتا۔ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جالپا اس کے کپڑے لاکر سامنے رکھ دیتی۔ پہلے پان مانگنے پر ملتے تھے۔ اب زبردستی کھلائے جاتے تھے۔ جالپا اس کا رخ دیکھا کرتی تھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ کھانے بیٹھتا تو وہ پنکھا کرتی پہلے وہ بڑے جبر سے کھانا پکانے جایا کرتی تھی اور اس پر بھی بیگار ہی ٹالتی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی سے رسوئی میں جاتی۔ چیزیں وہی پکائی جاتی تھیں مگر ان میں کچھ زیادہ مٹھاس آگئی تھی۔ رما کو ان الفت آمیز دلجوئیوں کے سامنے وہ زیور بہت ہی حقیر معلوم ہوتے تھے۔